"فائدہ! ارے جاہل محبت کیا فائدے کے لئے کی جاتی ہے؟ اور اگر سوچو تو فائدہ دراصل ایسی ہی محبوبہ کا ہوتا ہے جو محبت کے گرد ہمیشہ نور کا ہالہ بنائے رکھتی ہے وہ اس خمار میں حقیقت کی تلخی کو شامل نہیں ہونے دیتی ایسی محبوبہ مل جائے تو مرد ہمیشہ جوان رہتا ہے ہمیشہ آزاد رہتا ہے اس کی توند نہیں بڑھتی اس کا ماتھا پیچھے کو نہیں پھیلتا۔"

معظم نے زنگ آلود سلاخوں والی کھڑکی میں سے سمندر پر نظریں جما دیں۔ سمندر محو رقص تھا۔ لہریں گھٹ گھٹ کر جپھیاں ڈال رہی تھیں۔ دھکے مار رہی تھیں معظم اپنی زرم رو محبت کی تال پر ناچتا ناچتا تھک چکا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ رقص ختم ہو جائے اور وہ تھک کر رقاصہ کی بانہوں میں سو جائے بالکل کسی معصوم بچے کی طرح جو ماں کی چھاتی پر سر رکھ کر میٹھی نیند سو جاتا ہے اس کے گریبان میں ناخن گاڑ دیتا ہے۔

"انور نے چائے کا بل ادا کرتے ہوئے کہا۔ "سمندر کی طرف چلو گے؟"

"مجھے دیر ہو رہی ہے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا انور ـــــ"

"اور اس نیلے ساگر کے درشن کئے بغیر ہی لوٹ جاؤ گے؟"

"مجھے ایسے حسین نظاروں سے اب دلچسپی نہیں رہی۔ میں بلا واسطہ چاہنے سے تنگ آ گیا ہوں"

"کیوں؟ ـــــ"

"میں تمہیں کہہ تو چکا ہوں کہ میری محبت اب اس سٹیج سے نکل چکی ہے جب انسان چاند تاروں سے عشق کرتا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اب کسی کا ہاتھ ہاتھ میں ہو تو پھر میں سمندر کے پانی میں اتروں اور پھر اترتا ہی چلا جاؤں ـــــ اترتا ہی چلا جاؤں ـــــ اور وہ ہاتھ اور جسم میرے قریب ہوتا جائے"

انور نے کہا" ابھی واپس لوٹ جائیں گے مجھے سمندر کو سلام تو کر لینے دو ـــــ آؤ چلیں ـــــ"

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ معظم کو گھر لوٹ جانے کی جلدی تھی وہ حبیب مرزا کو عین باورچی خانے کے سامنے تخت پوش پر بیٹھا چھوڑ آیا تھا۔ لیکن اسے انور سے ابھی پیسے بھی لینا تھا اور وہ اس وقت انور کو ناراض کرنا نہ چاہتا تھا۔

ریستوران سے باہر نکل کر انور اور معظم نے اپنی جوتیاں اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیں۔

ساحل کنارے کراچی والی آپا شلوار اونچی کئے اپنی پنجاب سے آئی ہوئی بہن کا ہاتھ تھامے گیلی ریت پر کھڑی تھی۔ کچھ لوگ ساحل سے دور بیٹھے مٹھائی کھانے میں مشغول تھے اور دو لڑکے لنگوٹ باندھے ہاتھ میں ہاتھ دیئے لہروں کے تعاقب میں بھاگے جا رہے تھے۔ اتنی صبح تفریح کرنے والوں سے ساحل قریباً پاک نظر آتا تھا۔ وہ دونوں آہستہ اترتے ہوئے سبزی مائل نیلے پانی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ سنہری ریت پر لہروں کی آمد و رفت نے لکیریں ڈال رکھی تھیں۔

"اندر چلو گے؟ ـــــ" انور نے پینٹ کے پائنچے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!"

"کیوں؟ ـــــ"

"عمر گذر گئی ہے ایسی حرکتیں کرتے۔ اب جی نہیں چاہتا"

"بھلا کتنا عرصہ ہو گیا ہے سروس میں ـــــ"

"پانچ سال سے لڑکے دماغ چاٹ رہے ہیں۔ نہ انہیں کچھ آتا ہے نہ

ان کے پروفیسر کو!" معظم نے اپنے آپ سے کہا۔

انور نے اس کی بات منہ میں بات منہ ڈال کر کہا ـــــ "بقراط بننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر میں تمہاری طرح اتنے لمبے وقفوں کے بعد کراچی آتا تو میں پہلے سمندر دیکھنے آتا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہو چکا ہوتا کہ اس وقفے میں سمندر ضرور کہیں اور چلا گیا ہوگا ـــــ"

"تمہاری اور بات ہے ـــــ"

"کیوں؟"

معظم نے مسکرا کہا ـــــ "تم ابھی نوگرفتار ہو اور ایسے دور میں ہو جب ہر چیز طلسماتی نیرنگیاں دکھاتی ہے"

انور نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا ـــــ "تم واقعی ٹھیک کہتے ہو۔ میں تو جیسے خواب میں چلتا پھرتا ہوں۔ ہر اتوار میں یہاں آتا ہوں اور مجھے گھر سے یہ احساس کھینچ کر لاتا ہے کہ شاید سمندر یہاں سے دور چلا گیا ہو" جیسے وہ کہیں دور چلی گئی ہو۔

معظم مسکرایا اس کی مسکراہٹ سے اس کی اکتاہٹ عیاں تھی۔

"تمہیں چاہے جتنی بھی جلدی ہو میں پانی میں اترے بغیر جانے نہ دوں گا کیونکہ معظم اس پانی سے مجھے وہ یاد آتی ہے۔ اس روز وہ پانی میں دور تک چلی گئی تھی اور میں جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا تھا۔ تاکہ ..... تاکہ جب لہر اس کے پاؤں چھو کر میرے پاس آئے تو....."

معظم جلدی سے بولا ـــــ "دیکھا..... محبت ہل من مزید کی قائل ہے۔ فقط نظر سے کام نہیں چل سکتا انور اس کے لمس کا شوق لہروں کو بوسے دیتا ہے"

"خدا کے لئے بقراط نہ بن اور ہر چیز کا تجزیہ کرنے کو نہ بیٹھ جایا کر! آپا نی میں چلیں آ!....."

سیلی گدگدی ریت پر وہ دونوں ہولے ہولے آگے بڑھنے لگے۔ لہروں کا شور اتنا شدید ہوگیا تھا کہ جب کوئی لہر قریب آتی تو دونوں ایک دوسرے کی بات نہ سن پاتے۔ پانی پہلے گھٹنوں کو چھو کر لوٹ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ جب لہر کے چھینٹے گھٹنوں تک پہنچنے لگے تو انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے کے باوجود سمندر کے زور کو محسوس کیا۔

"چلو اب واپس چلیں"—— انور نے کہا۔

"چلو" معظم بولا..... "اب تم کچھ سمجھدار ہوگئے ہو"

"لیکن اُس طرف سے چلیں گے وہ لائٹ ہاؤس کے نیچے سے وہاں جہاں چٹان سی نظر آتی ہے میں ہمیشہ وہیں سے لوٹتا ہوں——"

"مجھے ایک بجے گھر پہنچنا ہے——"

"ابھی کل آئے ہو اور اب یوں تیزیاں دکھا رہے ہو۔ جیسے لاہور کی ٹرین پکڑنا ہو تمہیں اجازت ہے جاؤ لیکن میں منوڑا کے پیر کو سلام کئے بغیر اس جزیرے سے لوٹ نہیں سکتا" انور بولا۔

"واہ رے مجاور!—— مجھے تیری شخصیت کے اس پہلو کا علم نہ تھا۔" معظم نے طنز کی۔ انور ریت پر چلتے ہوئے بولا——" تم شاید یہاں کے پیر کی روایت سے ناواقف ہو—— سمندر چاہے کتنا بھی منہ زور کیوں نہ ہو جائے۔ چاند راتیں کتنی بھی سمندر کو دیوانہ بنائیں لیکن پانی کبھی منوڑا کے جزیرے پر نہیں چڑھتا۔ بھلا ایسی شخصیت کو سلام کئے بغیر میں کیونکر لوٹ سکتا ہوں؟"

"ہمارے شہر میں داتا کا مزار ہے لیکن میں تو وہاں کبھی سلام کرنے نہیں گیا۔ مجھے تیری مزار پرستی پر شبہ سا ہونے لگا ہے"۔ معظم نے کہا۔

لاہور میں تو ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرتا ہے؛ اسی لئے میں کبھی داتا کے

حضور نہ جا سکا" انور نے کہا۔

انور اور معظم سنہری ریت پر قدم بڑھاتے چڑھائی کی طرف چلنے لگے۔ سامنے قطب مینار جیسا اونچا لائیٹ ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ شام کو یہاں سے بندر پر آنے والے جہازوں کی رہبری میں گھومتا گیس سا جلنے لگتا۔ ساتھ ہی سگنل ٹاور تھا جو دور کھڑے جہازوں سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کے پاؤں ریت سے اٹے تھے اور کے گدگدی سی ہو رہی تھی۔ منوڑے کے پیر کا مزار گھاٹی سے اوپر ذرا سی ہموار جگہ پر تھا اور یہاں سے سمندر کا رقص صاف نظر آتا تھا۔

بڑی عقیدت سے انور نے سر پر چھوٹا سا رومال باندھا بمشکل پیسے چھوٹی سی گرہ دی پھر اس نے مٹکے میں آبخورہ ڈال کر پانی نکالا اور کلی کر کے دونوں ہاتھ فاتحہ کے لئے اٹھائے معظم کی نگاہیں مزار پر جمی تھیں۔ یہ مزار پنجاب کے مزاروں سے اس لئے مختلف تھا کہ یہاں کی ہر چیز صاف ستھری اور بڑی آراستہ تھی اور پتہ نہیں وہ کونسی چیز یہاں تھی جو بار بار اسے سندھی کڑھائی یاد دلا رہی تھی۔ خوبصورت نائیلون کا فرش ریت کے اتنے قرب کے باوجود گرد سے بالکل پاک تھا۔ ایک ذرہ بھی فرش پر نظر نہ آتا تھا چھت کے ساتھ ساتھ اور مزار کے جنگلے کے ارد گرد کاغذی پھولوں کی نہایت نازک چادر سائبان کی طرح منڈھی تھی۔ اسی کاغذی پھولوں کی چادر نے ساری جگہ کو دلہن کی سی آراستگی اور کنواری لڑکی کی سی نزاکت بخش دی تھی۔ پنجاب میں مزاروں پر عموماً موتیے اور گیندے کے پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی تھیں۔ جا بجا سرخ گلاب کی ٹوٹی ہوئی پتیاں نظر آتی تھیں اور جب یہ پھول باسی ہو جاتے ہیں تو ان کا رنگ بھورا اور خوشبو باسی ہو جاتی ہے ـــــ معظم کو اسی خوشبو سے چڑ تھی اسے ہر مزار پر جا کر موت کا سایہ اپنے ارد گرد منڈلاتا نظر آتا تھا۔

معظم محض انور کو خوش کرنے کی غرض سے اس مزار پر آیا تھا۔ لیکن یہاں کی پاکیزگی، طہارت اور حسن کو دیکھ کر اس کے جی میں ہوک سی اٹھی اس نے دونوں ہاتھ جنگلے پر رکھ دیئے اور سر کو سینے پر نیہوڑا کر جی ہی جی میں بولا ——— اے منوڑے کے پیرا میں اپنی زندگی سے تھک گیا ہوں۔ میں اسی تھوتھی محبت سے تنگ آگیا ہوں جو برسوں سے اہرام بن کر میرے دل میں جاگزین ہے۔ مجھے اس کرب سے نجات دلا ——— اے نازک چادر والے! میں اُس خلوت کے لمحے کا منتظر ہوں جب زرقا کے اور میرے درمیان کچھ بھی حائل نہ رہے ——— میں جذباتی خط لکھ لکھ کر تھک گیا ہوں۔ میں کراچی کے چکر لگا لگا کر عاجز آگیا ہوں ——— اب یا تو مجھے ....."

اور پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے انور اس کے قریب کھڑا اُس کی دعا کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو اس نے مندی ہوئی آنکھیں کھول کر انور پر نظر ڈالی وہ بدستور ہاتھ اٹھائے رومال باندھے دعا مانگنے میں مشغول تھا۔ معظم نے سر جھکا کر ایک بار پھر منوڑے والے پیر سے لو لگانا چاہی لیکن سمندر کی ایک لہر کی طرح عقیدت کا مجسمہ ساحل کو چوم کر لوٹ چکا تھا۔

٭ ٭ ٭

حبیب میرزا ان آدمیوں میں سے تھا جو سوچتے ہیں کہ اگر تنا ہلایا جائے تو پھل خود بخود زمین پر آگرتا ہے۔ اپنی واقفیت کے اولین عہد سے لے کر آج حبیب میرزا نے اپنی تمام توجہ اماں جی پر مرکوز رکھی تھی۔ اس توجہ کا فوکس کبھی نہ دھندلایا۔ اور کبھی اماں جی کو لمحہ بھر کے لئے احساس نہ ہو پایا کہ حبیب میرزا ان کی لڑکی زرقا کے لئے یہاں آتا ہے۔ دراصل اماں جی نے کراچی کے قیام کے یہ چند سال جیسے بیوگی میں کاٹے تھے۔ خان صاحب کو بیت چلے

گئے تو پہلی بار انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور بڑی شدت سے ہوا۔ ان کے ارد گرد پانچ لڑکیوں کا جم غفیر یوں پھنکارا جیسے ان کی ناموس کو ڈسنے آ رہا ہو۔ اس ناموس اور عزت کے بت کی انہوں نے ساری عمر پرستش کی تھی اور جونہی انہیں لگا کہ بچیاں لمبے کرتے چنے ہوئے دوپٹے، اونچی ایڑی کی جوتیاں اور کویت سے آئے ہوئے نقلی زیور پسند کرنے لگی ہیں تو وہ مسلح سپاہی کی طرح اپنی بچیوں پر پہرہ دینے بیٹھ گئیں۔ کبھی کبھار ان کی بیجا مداخلت سے تنگ آ کر بڑی لڑکیاں اگر اونچے بول پڑتیں۔ تو وہ جھٹ قلم اور کاغذ اٹھا خان صاحب کو خط لکھنے بیٹھ جاتیں۔

"خان صاحب جی! ——— میں کہتی ہوں مجھے ریشمی کپڑا نہیں چاہیئے مجھے فریج اور کار کی ضرورت نہیں سونا دونا اکٹھا کرنا چھوڑیئے۔ لڑکیاں سیانی ہوگئی ہیں ——— دو کانچ کی چوڑیاں پہنا کر انہیں اپنے گھر روانہ کیجئے ——— کیوں میری چھاتی کا بوجھ بڑھاتے جاتے ہیں آپ"

لیکن جب لڑکیاں دوہری بکل مار پائینچوں میں پاؤں چھپا کر ان کے سامنے بیٹھا کرتیں تو ان کے سارے وسوسے ختم ہو جاتے۔ اور وہ سوچتیں کہ اگر اس بار خان صاحب آ گئے تو میں لڑکیاں لے کر ان کے ساتھ کویت چلی جاؤں گی سونا وہاں اس قدر سستا ہے کہ اگر چار چار چوڑیاں بھی ایک ایک کے ہاتھ میں آ گئیں تو زرقا کے فرض سے بخوبی سبکدوش ہو جاؤں گی ———

کراچی میں رہنے کے باعث زرقا کی شادی ان کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی۔ اگر کبھی وہ لاہور میں ہوتیں تو برادری کے تمام لڑکے دیکھ بھال کر کبھی کا زرقا کو رخصت کر چکی ہوتیں ——— یہاں تو لے دے کے ایک معظم اور حبیب میرزا ہی نظر آتے تھے۔

معظم میں اور کوئی خرابی تو اماں جی کو نظر نہ آتی تھی لیکن تنخواہ بے حد قلیل

تھی! آخر تین سو روپے میں زرقا کیا کرے گی ، کویت سے آیا ہوا ریشم پہننے کی عادی، زرقا تو عمر بھر ایک ریشمی تار کو ترس جائے گی! اماں جی کو علم تھا کہ زرقا اور معظم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ زرقا اور معظم میں خط و کتابت بھی جاری ہے لیکن ساتھ ہی انہیں اپنی نگرانی پر بڑا ناز تھا وہ خوب جانتی تھیں کہ فیصلہ ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پسند و ناپسند کے بس میں نہیں۔ شروع مہینے میں جب رات کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی دیوار پر لگی ہوئی تصویر پر سامنے والے سینما گھر کی بتیوں کی رنگ برنگی روشنی پڑتی اور انہیں خان صاحب کی نیکیاں یاد آتیں تو وہ اپنی زرقا کو اپنے ہاتھوں دلہن بنا کر معظم کے ساتھ رخصت کر دیتیں لیکن جب مہینے کے آخر میں خرچ کی کمی واقع ہوتی اور خان صاحب کی ہمدردی پر اماں کو شبہ ہونے لگتا تو وہ حبیب میرزا کو اپنا داماد بنانے کے خواب دیکھتیں۔

میرزا نے جس روز زرقا کو پہلی بار دیکھا وہ ایک ریستوران میں فرائی مچھلی پر ٹماٹر کی چٹنی لگا کر کھا رہا تھا۔ سارے ہوٹل میں سمندری مچھلی کی بو باس پھیلی ہوئی تھی سمندری ہوا سے ریستوران کے داخلی دروازے کا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ پھر اچانک عقبی نشستوں سے جہاں کیبن بنے ہوئے تھے پوڈر کولون اور میکس فیکٹر کے میک اپ کی خوشبو اٹھی۔

حبیب میرزا نے خدا جانے کیوں چھری کانٹا پلیٹ میں دھر دیا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔

پانچ چوزوں کو ہانکتی اماں جی باہر چلی آرہی تھیں۔ لیلیٰ اور شیریں آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ اور چھوٹی دونوں لڑکیاں روٹھے روٹھے چہرے لئے ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو گھورنے میں مشغول تھیں۔ سب سے آخر میں زرقا تھی۔

اس نے نقاب اٹھایا ہوا تھا۔ چہرے پر پاؤڈر کی نامعلوم سی تہہ اور لپ سٹک کے غیر قدرتی رنگ کا جماؤ تھا۔ ایک ہی نظر میں زرقا کا چہرہ پُر جمال، برقعہ لپ سٹک پاؤڈر سب کچھ حبیب میرزا کو اس قدر اچھا لگا کہ اس نے مچھلی کا قتلہ پلیٹ میں چھوڑا اور جلدی سے بل ادا کر کے ان کے پیچھے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے بھی حبیب میرزا نے ایک بار اپنے دفتر کی ایک لڑکی سے جی ہی جی میں والہانہ عشق کیا تھا۔ لیکن وہاں نوبت تعاقب تک نہ پہنچی تھی۔

اگر اس دن اماں جی لڑکیوں کو بس میں لے کر غائب ہو جاتیں اور پھر اُسے کبھی نظر نہ آتیں تو شاید عشق بھی اس کے ذہن میں ہی دم توڑ دیتا۔

لیکن چند دن بعد اسے اماں جی بنک میں مل گئیں۔ وہ کسی چیک کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ بنک والے انہیں رقم ادا کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ کوئی ٹکنیکل سی مشکل تھی لیکن ادھر اماں جی رقم وصول کرنے پر مصر تھیں ادھر بنک والا ادائیگی سے معذوری ظاہر کر رہا تھا۔ حبیب میرزا اماں جی کے پاس پہنچا اور بڑی ہچکچاہٹ سے بولا ——— "شاید آپ کو کچھ مشکل پیش آرہی ہے" اتنے مصروف بنک میں جہاں ہزاروں لوگ نفسا نفسی کا شکار ہو رہے تھے حبیب میرزا کی نظرِ کرم ان کے لئے بڑی تسکین دہ ثابت ہوئی انہوں نے چیک میرزا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "یہ کویت سے آیا ہے جی۔ ہر مہینے میں چیک بھنوانے آتی ہوں لیکن آج خدا جانے یہ کیوں اسے کیش کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

حسن اتفاق سے حبیب میرزا کی مینجر سے اچھی واقفیت تھی اس نے چیک اماں جی سے لیا اور انہیں ایک سٹول پر بیٹھ کر کے اندر چلا آیا۔ جب وہ چیک کے بجائے اماں جی کو پیسے دے چکا تو اس کی واقفیت کویت والوں سے

ہو چکی تھی ـــــ اور یہ واقفیت خاک اس کے کام نہ آتی اگر اس نے اس دن ریستوران میں زرقا کو نہ دیکھا ہوتا!

اماں جی نے ایک بوتل نما صراحی حبیب میرزا کو دکھاتے ہوئے کہا ـــــ "ابھی کل ہی کویت سے آئی ہے۔"

حبیب میرزا نے صراحی کو ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے اس کا جائزہ لیا اور پھر بڑے وثوق سے کہا ـــــ "ایسی ہی سوڈا بھرنے والی بوتل پچھلے دنوں میں نے ایک امریکن کے ہاں دیکھی تھی۔"

"آپ سوڈا پئیں گے تو میں بنا دوں" شیریں نے پوچھا۔

"نہیں بھائی اب کھانا کھانے کا وقت ہے کہ سوڈا پینے کا؟ ـــــ"

زرقا کھانا پکانے کے بعد غسلخانے میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ لیلیٰ صحن والے برآمدے میں لمبے میز پر برتن لگانے میں مشغول تھی۔ فضا میں کچے ٹماٹر اچار اور پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"تم کھانا کھا لو حبیب ـــــ معظم تو خدا جانے کب آئے گا؟" اماں بولیں۔

"نہیں جی ابھی بھوک نہیں لگی اور پھر پروفیسر صاحب آئیں تو سب کھائیں گے" حبیب نے خوش اخلاقی سے کہا۔

زرقا نے اس خوشامدی پر ایک نظر ڈالی اور لمبی ہیل والے سلیپر بجاتی اندر چلی گئی۔ اسے حبیب میرزا کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی کوفت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اُسے رہ رہ کر یہ بھی غصہ آ رہا تھا کہ معظم ساڑھے سات سو میل کا سفر محض انور سے ملنے کی خاطر طے کر کے آیا ہے؟ کراچی پہنچے ابھی اسے بمشکل تمام اکیس گھنٹے ہوئے تھے اور ابھی سے یہ بے نیازی؟ ابھی سے یہ بے رخی؟ اس سے پہلے

تو معظم نے کبھی ایسے نہ کیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اسے یوں لگا کہ سر میں درد ہو رہا ہے اس نے سفید دوپٹہ آنکھوں پر رکھا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔

لیلیٰ نے اپنی تھوتھنی سی ناک فضا میں اٹھا کر کہا ـــــ "حبیب صاحب! آج آپا نے وہ غضب کے شامی کباب بنائے ہیں کہ آپ کبابوں کے ساتھ انگلیاں بھی کھا جائیں گے۔"

"صاحب ہم تو ہمیشہ کے قائل ہیں ـــــ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ اماں جی جیسے پسندے تو وہ دس بار پیدا ہوں تو بھی نہ پکا سکیں گی۔"

اماں نے مسکرا کر حبیب کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "اب تو کبھی باورچی خانے میں گھس کر بھی نہیں دیکھا۔ کبھی خان صاحب سے پوچھنا۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ میرے ہاتھ کا پکا ہوا مرغ مسلم کھا کر ہی انہوں نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا ـــــ"

رانی لیلیٰ کے پاس کھڑی صافی سے چمچے کانٹے صاف کر رہی تھی اس نے کوئی بارھویں مرتبہ کہا ـــــ "ہائے لیلیٰ آپا ایک کباب دے دو سچ! کسی کو پتہ بھی نہ لگنے دوں گی ـــــ"

"عجب ندیدی سے پالا پڑا ہے کہہ جو دیا کہ سب کے ساتھ کھانا ہاں ـــــ" لیلیٰ نے ڈانٹ بتائی پھر اس نے حبیب میرزا کی طرف رُخ کر کے پوچھا ـــــ "کیا وقت ہوا ہے حبیب بھائی" ڈیڑھ بجنے لگا ہے ـــــ قریباً اسے جواب ملا۔

"تم کھانا کھا لو حبیب۔ بچیوں کے لئے بھی ڈال دیتی ہوں۔ میں مجو کے ساتھ کھا لوں گی" اماں بولیں "میں بھی مجو بھائی کے ساتھ ہی کھاؤں گی امی ـــــ" لیلیٰ بولی۔

"ہمیں تو شوق سے کھلا دیجئے" شیریں نے ہاتھوں کی چوڑیاں بجا کر کہا اور پھر اپنی زبان میں لیلیٰ سے مخاطب ہوئی ——— "انتظار کریں زکی بھائی کریں، ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے"

ککو نے ابھی سے کلفٹن جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ ہاتھ پیر دھو کر چھوٹی سی پیڑھی پر غسلخانے کے سامنے بیٹھی اپنے ناخنوں پر گہرے سرخ رنگ کا پالش لگا رہی تھی۔ روز وہ بارہ بجے کھانا کھانے کی عادی تھی لیکن آج کلفٹن کا سن کر اُسے کھانا بھول چکا تھا۔ پالش کے دھبے ناخنوں کے علاوہ ہاتھوں پر بھی اتر آئے تھے، لیکن وہ اپنی آرائش سے خوش تھی پالش کا برش بوتل میں ڈالتے ہوئے اس نے چلا کر کہا ——— "آپا شیریں ——— شیریں آپا مجھے وہ موتیوں والا فراک نکال دیں!"

"کونسا فراک؟" شیریں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"وہی آپا نیلے والا ———"

"ہائے کونسا نیلے والا؟ ——— مجھے تمہارے کپڑوں کی فہرست تو یاد ہے نہیں ———"

بڑی احتیاط سے پنجوں کے بل چلتی ہاتھوں کو جسم سے دور رکھے ککو شیریں کے پاس پہنچ کر بولی۔

"آپا! ——— وہ جو آپا جی پچھلے سال لائے تھے ریڈی میڈ آپا جس پر موتی لگے ہیں"

شیریں خفگی سے کہنے لگی "وہ کوئی سمندر پر جانے والا فراک ہے سارا خراب ہو جائے گا پانی میں ———"

اماں نے باورچی خانے سے آواز دی ——— "ارے شیریں زکی کو بلاؤ میں

کھانا نکال رہی ہوں تم سب گرم گرم کھالو میں مجوّ کے ساتھ کھا لوں گی "

گلّو نے منت بھرے لہجے میں کہا ـــــ " آپا قسم لے لو میں پانی میں نہیں جاؤں گی جی ـــــ خدا قسم "

" اچھا اچھا دیکھوں گی ـــــ تم جا کر اندر سے زکی آپا کو بلا لاؤ۔ کہنا اماں کھانے کے لئے بلا رہی ہیں "

جب گلّو زکی آپا کو اندر لینے گئی تو لمحہ بھر کے لئے حبیب میرزا کی آنکھیں اس کے تعاقب میں گئیں جیسے زکی کو لینے جا رہی ہوں پھر وہ دوگنے انہماک کے ساتھ باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے ہو کر اماں جی سے باتیں کرنے لگے۔

زکی سر پر دوپٹہ لئے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ پردے گرے ہوئے تھے اور اندر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ یہاں اُسے عجیب محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا مجوّ اس سے بات کرے یا نہ کرے اُس کی طرف دیکھے نہ دیکھے لیکن گھر پر رہے۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے مجوّ کے لئے کھانا تیار کیا تھا اور مجوّ اس وقت انور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ زکی کو یوں لگ رہا تھا جیسے اب مجوّ کو اس میں وہ دلچسپی نہیں رہی۔ مجوّ وہ نہیں رہا جو آج سے چھ ماہ پہلے تھا ورنہ وہ آج اس وقت یوں باہر نہ جاتا۔ کیا اکیس گھنٹوں میں شوقِ دید اس قدر ماند پڑ گیا تھا؟ کیا ایک رات فلیٹ میں گزارنے کے بعد ہی اس کا جی اُوب گیا تھا اور اُسے انور کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

جب گلّو نے زور سے آواز دی تو وہ یوں چونک پڑی جیسے اُسے کسی نے برہنہ دیکھ لیا ہو۔

" آپا کھانا کھا لو چل کر اماں بلا رہی ہیں "

" میرے سر میں درد ہے تم سب کھا لو ـــــ "

"تو تم کلفٹن نہیں جاؤ گی آپا؟" ککو نے گھبرا کر پوچھا۔
"تم سب چلے جانا ——— میں گھر پر رہوں گی"
یکدم ککو کا دل ڈوب گیا۔ اس نے جلدی سے کہا ——— "آپا آپ اسپرو کھالیں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی" پھر قریب آکر بولی۔
"میں سر دبا دوں آپا؟ ———"
ککو کی گھبراہٹ دیکھ کر ایک لمحے کے لئے زکی کا سر درد غائب ہو گیا۔ اس نے ککو کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آہستہ سے بولی ——— "تم جاؤ ککو بڑی دیر ہو گئی ہے کھانا کھالو ———"
جب ککو ناخنوں کا پالش چھیلتی باہر نکلی تو پہلی چیز جو اسے نظر آئی وہ مجو بھائی تھے لیلیٰ پانی کا لوٹا لئے کھڑی تھی اور وہ نالی پر جھکے ہاتھ دھو رہے تھے۔ ککو اُلٹے پاؤں آپا کے کمرے میں واپس گئی اور پردہ اٹھا کر بولی ——— "آپا آپا جی مجو بھائی آگئے ہیں۔ سب کھانے پر آپ کو بلا رہے ہیں جی ———"
زرقا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بددلی سے بولی ——— "توبہ کہہ تو رہی ہوں تم سب کھالو مجھے بھوک نہیں"
ککو اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی پہلے تو زرقا کا جی چاہا کہ اٹھ کر چلی جائے لیکن پھر اس کے جی میں آیا کہ مجو کی اس بے نیازی کا بدلہ لینا چاہیئے۔ وہ کہنی ٹکا کر لیٹ گئی اور آہستہ سے بولی ——— "تو جاتی کیوں نہیں ککو؟"
ککو نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر کہا ——— "آپا! ——— آپا میری خاطر چلی چلو ..... آپا تم نہیں جاؤ گی تو کوئی بھی نہیں جائے گا ——— کوئی بھی کلفٹن نہیں جائے گا آپا ———"
یہ کہہ کر اس نے سرخ پالش لگے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور پھپک پھپک

رونے لگی۔

زرقا گھبرا کر اٹھی اُس نے دونوں ہاتھوں میں گلّو کا چہرہ لے لیا اور جلدی جلدی بولی "ہائے اللہ رونے کیوں لگ گئیں، چپ کرو ـــــ چپ کرو..... ہائے بابا میں چل رہی ہوں..... چل رہی ہوں میں تو!"

☆ ☆ ☆

لالو نے دونوں ہاتھوں سے جھونپڑی کا دروازہ پٹاخ سے کھولا اور پھر دہلیز میں کھڑے ہو کر بولا ـــــ "کیوں ری ماں تو گئی نہیں ابھی تک ـــــ"

" جاؤں کیسے، جیب میں ایک کوڑی تک نہیں بس کا کرایہ ہوتا تو چلی بھی جاتی "

" تو چل کر پہنچ جاتی۔ اماں جی کو تو تیرا درد رہتا ہے ـــــ"

ماں نے چڑ کر کہا ـــــ " وہاں کسے میرا درد نہیں تھا۔ کبھی لڑکیوں نے میرے سامنے اونچی آواز نہ نکالی بے چاری زکّی بی بی کا بھلا ہو ہمیشہ مائی جی کہہ کر بلاتی تھیں۔ اتنی عزّت تو تُو نے بھی نہیں کی میری"

لالو نے سگریٹ کا ٹوٹا سلگایا اور غصّے سے بولا ـــــ " یہی تو میں کہتا ہوں ماں، مجھ سے زیادہ تو وہ تیرے سگے تھے پھر تو گئی کیوں نہیں؟"

" ارے لالو کہے تو جا رہی ہوں کہ پلّے ایک دمڑی تک نہیں۔ جاتی کیسے؟"

" اور کہیں شادی بیاہ ہو تو کیسے پہنچ جاتی ہے چل کر اب بھی چلی جاتی ناں؟"

ماں نے منہ کو دوپٹہ سے پونچھ کر کہا ـــــ " چلی جاؤں گی لڑکے! چلی جاؤں گی ـــــ آج میری ٹانگ میں زیادہ درد تھا، پھر صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں چلنے کی ہمت کہاں سے آتی!"

" آج تو وہ مجّو میاں بھی آیا ہوا ہے ـــــ خوش ہو کر زکّی بی بی ضرور کچھ نہ کچھ

دے دیتی تجھے" ماں نے مارے غصّے کے کچھ نہ کہا اور گھڑے میں سے پانی نکالنے لگی۔ اس کائی جمے گھڑے کو لالو کی ماں کویت والوں کے گھر سے خود لائی تھی اس نے غٹا غٹ پورا کٹورہ پانی کا پی لیا اور پھر قہر بھرے لہجہ میں بولی "تجھ سے میں نے سو مرتبہ کہا ہے کم ذات تیری بھی جوان بہن لاہور میں بیٹھی ہے۔ کسی کی ماں بہن کو بات بنائے گا تو بہن کے آئے گی"

لالو ہنس کر بولا ——— "ارے اس کی کونسی عزّت ہے زیادہ سے زیادہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی ناں؟"

ماں نے کٹورہ اس کی طرف کھینچ مارا اور گالیاں بکتی ہوئی بولی ——— "ارے ماں جائی کے لئے ایسی باتیں کہتا ہے تجھے زکی بی بی سے کیا۔ وہ فرشتہ ہے فرشتہ۔ میں نے تو کبھی اُسے مجو میاں سے بات تک کرتے نہیں دیکھا جو کبھی خط پتر بھی آتا ہے تو ہمیشہ اماں جی کو دے دیتی تھی!"

"دے دیتی ہو گی ماں! ——— لیکن میں کہتا ہوں دنیا کی کوئی لڑکی بھی فرشتہ نہیں۔ فلم والیاں کیا پاؤ پاؤ کے آنسو بہاتی ہیں پر..... پر"

ماں بغیر اور رائین کی چارپائی میں اترتے ہوئے بولی "اے لالو ——— تجھے کب عقل آئے گی نامراد! بہن کو لاہور چھوڑ آیا۔ وہ کنجر تیرا چاچا خدا جانے اسے کس کوٹھے پر چڑھائے گا اور یہاں تجھے منڈوے کی پڑی ہے۔ میں کہتی ہوں کچھ کام ڈھونڈ کام ———"

"تو کام سے کیا رکھی کی شادی ہو جائے گی ماں ——— تو بھی کیسی باتیں کرتی ہے؟"

ماں تنک کر بولی ——— "ارے بیس پچیس پر اگر لگ جائے تو ہم یہ جھگی چھوڑ جائیں۔ کرائے کے جنجال سے جان چھوٹ جائے۔"

لالو نے پوچھا ـــــ "اور ماں اب کیا ہم کرایہ ادا کرتے ہیں؟"

"یہ تو دو مہینے سے مصیبت پڑی ہے ورنہ کیا دیتے نہیں تھے کرایہ..."

ماں نے ماتھا پیٹ لیا اور روتے ہوئے بولی ـــــ "تو تو بس بحث کرنی جانتا ہے اور میں مصیبت میں گھری ہوں۔ خدا جانے اس بیچاری رکھی کا کیا فیصلہ ہوگا۔ مرگئی ہے کہ جیتی ہے۔ پندرہ دن سے تو خط بھی نہیں آیا ـــــ"

"تجھے اتنا درد ہے تو ماں تو یہ جھگی چھوڑ دے نا" ـــــ "کویت والوں کے یہاں کیوں نہیں چلی جاتی ـــــ"

اب ماں لنگڑاتی ہوئی اس کے پاس پہنچی اور اسے جھنجھوڑ کر کہنے لگی ـــ "اچھا تو دے پیسے چلی جاؤں گی صبح خدا قسم چھوڑ جاؤں گی تجھے ـــ اب تک مامتا ساتھ لئے پھرتی تھی۔ اب چھوڑ دوں گی ـــ"

"تو نہ جائے گی ماں تو کل مالک مکان نکال دے گا تجھے۔ پھر جو جائے گی تو ابھی کیوں نہیں چلی جاتی"

"جب نکال دے گا تو آپ چلی جاؤں گی تجھے کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے؟"

لالو بجھے ہوئے چولہے کے پاس آکر بیٹھ گیا اور راکھ میں اپنی سگریٹ کا جلتا ٹکڑا پھینک کر بولا ـــــ "ماں آج مجو میاں آئے ہیں وہاں ضیافت ہو رہی ہوگی آج تو چلی جائے تو پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے"

"میں بھک منگی نہیں ہوں بے"

"ماں آج وہاں سب غفلت کی نیند سوئیں گے ہن برس رہا ہوگا وہاں"

"کیوں؟ ـــــ" اماں نے پوچھا۔

"کہا تو ہے مجو بھائی آئے ہیں"

"پر تجھے کیسے پتہ لگا مجو میاں کا ـــــ" ماں نے پوچھا۔

خالی ہانڈی کو چولہے پر سے اتار کر لالو نے نیچے رکھا اور پھر ہنس کر بولا
"بس میں نے دیکھا تھا انہیں ——"

"اور بس کے پیسے کہاں سے مل گئے تھے ——"

"وہ تو پھتّو نے دیئے تھے ——" لالو بولا۔

ماں نے دوپٹے کا پلّو کھولا اور دوّنی اس کی طرف پھینک کر کہنے لگی —— "دیکھ بے لالو —— پھتّو رکھّی کے ہونے والے سسرال کا آدمی ہے تو اس سے مانگ تانگ کر بس میں سفر نہ کیا کر ——!"

لالو نے دوّنی اٹھا کر باہر کی طرف جاتے ہوئے کہا —— "ماں تو آج شام یہاں سے چلی جانا ضرور —— مالک مکان نکال دے گا ہم دونوں کو صبح —— اور پھر میں آج نہیں لوٹوں گا شام کو ——"

"لیکن تو چلا کہاں ہے بے لالو —— ارے لالو اے ——"

ہونکتی ہانکتی ماں باہر نکلی تو لالو کافی دور جا چکا تھا۔

ماں چلائی —— "ارے بتا تو کہاں سر چھپائے گا جا کر ——"

لالو نے لمحہ بھر کو منہ پھیرا اور اونچی آواز میں للکارا —— "تجھے میری فکر کیا ہے تو بس کویت والوں کے یہاں چلی جانا ہاں ——"

⁂ ⁂ ⁂

مجّو سب سے آخر میں اترا۔

بس گھر گھر کرتی ہوا بندر کی طرف چلی گئی۔ سیسہ پلائی پکی میٹل روڈ ہوا بندر کے پاس آ کر بہت چوڑی ہو گئی تھی اور یہاں پہنچ کر یوں لگتا تھا جیسے بہت لمبے سیمنٹ کے بنے ٹینس لان آپس میں جڑ گئے ہیں۔ بس سے اترتے ہی مجّو نے ہوا بندر کی جانب رُخ کر کے اپنی گھڑی دیکھی اس جگہ کو دیکھ کر خدا جانے کیوں

اُسے لائلپور کا گھنٹہ گھر یاد آجاتا تھا حالانکہ نہ تو ساخت میں کوئی مماثلت تھی اور نہ ہی بظاہر ماحول کی کوئی ایسی چیز تھی جو ایک دوسرے کی یاد دلائے لیکن مجو اس نتیجے پر پہنچا۔۔۔ کہ چونکہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اس لئے ایک کو دیکھ کر دوسرے کی یاد آتی ہے۔

گھڑی میں پورے تین بجکر چار منٹ ہوئے تھے۔ ابھی کل قریباً اسی وقت وہ کویت والوں کے ہاں پہنچا تھا۔

ککو اور رانی بھاگ کر چنے والے سے چنے خریدنے میں مصروف ہو گئیں اور حبیب میرزا ان کے پاس اس لئے کھڑے تھے کہ پیسوں کی ادائیگی کے وقت وہ اپنی چابکدستی دکھا سکیں۔

سمندر کا یہ حصہ منوڑا سے بہت مختلف تھا۔ بہت دور سے سست رو سمندر ساحل کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا تھا۔ سڑک کے اس کنارے جہاں بسیں، ٹیکسی، اور رکشا وغیرہ کھڑے کرنے کا انتظام تھا وہاں سے لے کر ساحل کے کنارے تک بتدریج سیڑھیوں کا ایک سلسلہ جاتا تھا کہتے ہیں کسی زمانے میں سمندر ان سیڑھیوں تلے بنے ہوئے محراب دار پلوں میں سے گزرتا تھا۔ لیکن اب ریت کے تودے ارد گرد پھیلے تھے۔ سڑک سے کچھ فاصلے تک بچوں کے کھیلنے کے لئے سی سو جھولے اور پھسلنے والی پکی گھاٹیاں بنی تھیں لیکن پھر باغ و بہار کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اور لہریا ریت کے تودے ہر طرف پھیلنے لگتے تھے۔ جو لوگ ان سیڑھیوں پر سے اتر کر ساحل کنارے نہیں جاتے وہ بتدریج اترتی سڑک پر سے ہو کر ساحل کی طرف جا نکلتے ہیں۔ لیکن مجو کے نزدیک وہ راستہ اس قدر رومانٹک نہ تھا شیریں اور لیلیٰ ہولے ہولے سیڑھیاں اترنے لگی تھیں۔ زرقا خدا جانے کس سوچ میں تھی اس کے برقعے کا نقاب اڑ رہا تھا۔ آنکھوں پر لگی ہوئی سیاہ عینک کے پیچھے

وہ آنکھیں کسے دیکھ رہی ہیں اس کا اندازہ مجو لگا نہ سکا۔ جب گگو اور رانی نے چنے خرید لئے تو وہ دونوں حبیب بھائی کے ساتھ بائیں جانب چلی گئیں۔ سیڑھیوں کے بائیں طرف ایک بہت بڑا مزار ہے اور اس کے طاقچوں میں ہزاروں کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کیا کرتے ہیں۔

گگو اور رانی نے دیوار پر چڑھ کر کبوتروں کو دانہ ڈالا تو پرے مزار سے اڑ کر اس طرف آ گئے۔

اماں جی نے حبیب بھائی سے کہا ـــــ "آؤ چلیں۔ یہ تو یہاں شائد کبوتروں کی خاطر آئی ہیں"

مجو نے کنکھیوں سے زرقا کی طرف دیکھا وہ زیرلب مسکرائی اور پھر اس سے آگے آگے چل دی ان دونوں میں فقط ایک گز کا فاصلہ تھا۔ اگر مجو چاہتا تو بازو پھیلا کر اس کا نقاب کھینچ سکتا تھا۔ لیکن آج تک مجو نے ایسی کوئی شرارت نہ کی تھی۔ ان دونوں میں ازل سے یہ سمجھوتا ہو چکا تھا کہ کوئی چھچھوری حرکت کوئی گھٹیا بات ہمارے درمیان ہو ہی نہ سکے گی ـــــ مجو اس سوئی سوئی محبت سے بھلا اٹھا تھا۔ سیڑھیاں اترتی کبوتری سی زرقا کو دیکھ کر ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لے اور پھر چاہے اماں جی ایک زمانہ اکٹھا کر لیں اسے کبھی اپنے تن سے جدا نہ کرے لیکن پھر اس نے نظریں جھکا لیں اور گلابی مائل بادامی پتھروں کی دیوار دیکھنے لگا جو سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھی۔

"ایک تو کم بخت ان سیڑھیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا ـــــ اسی لئے مجھے کلفٹن زہر لگتا ہے"

اماں جی بولیں ـــــ